

فطرت کی راہ

<?xml encoding="UTF-8?">

سوال: کیا موجودہ دنیا کے حالات اور روز مرہ حیرت انگیز ترقی کے پیش نظر باور کیا جاسکتا ہے کہ اسلام عالم بشریت کا نظم و نسق چلا کر موجودہ ضرورتوں کو پورا کر سکے گا؟

کیا حقیقت میں وہ وقت نہیں پہنچا ہے کہ جب انسان علم کی قدرت سے آسمانوں پر کمند ڈال رہا ہے اور ستاروں کو تسخیر کرنے جا رہا ہے، اب اسے ان کہنہ مذہبی افکار کو بالائے طاقت کر اپنی قابل فخر زندگی کے لئے ایک نئے اور تازہ طریقہ کار کا انتخاب کر کے اپنی فکر و ارادہ کی طاقت کو اپنی شاندار کامیابیوں پر متمرکز کرنا چاہئے؟ جواب: اس سوال کا جواب دینے سے پہلے ایک نکتہ کی طرف توجہ مبذول کرنا ضروری ہے اور وہ یہ ہے: صحیح ہے کہ ہم فطری طور پر ہر نئی چیز کو پرانی چیز کی نسبت پسند کرتے ہیں اور ہر چیز کے نئے پن کو اس کے پرانے پن پر ترجیح دیتے ہیں لیکن بہر حال یہ کوئی کلی قاعدہ نہیں ہے اور اس طریقہ کار کو ہر جگہ پر لاگو نہیں کیا جاسکتا۔ مثال کے طور پر دو اور دو چار جو لاکھوں اور ہزاروں سال سے انسان میں رائج ہے اور اس سے استفادہ کیا جاتا ہے، اسے کہنہ سمجھ کر دور نہیں پھینکا جاسکتا ہے! یہ کہنہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ عالم بشریت میراث اجتماعی اور معاشرتی زندگی اب کہنہ ہو چکی ہے، اس سلسلہ میں ایک نیا منصوبہ مرتب کر کے انفرادی زندگی کا آغاز کیا جان چاہئے۔ یہ کہنہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ ملکی قوانین جو کافی حد تک انسان کی انفرادی آزادی پر پابندی عائد کرتے ہیں، اب کہنہ ہو چکے ہیں اور لوگ ان سے تنگ آچکے ہیں، اس وقت جب کہ انسان فضا کو تسخیر کرنے میں لگا ہے اور ستاروں کی معلومات حاصل کرنے کے لئے ان کے مدار میں سلاٹ بھیج رہا ہے اس لئے ایک نئی راہ کا انتخاب کرنا چاہئے اور قانون، قانون ساز اور قانون لاگو کرنے والوں کے چنگل سے آزاد ہونا چاہئے۔ واضح اور روشن ہے کہ یہ باتیں کس حد تک بے بنیاد اور مذاق پر مبنی ہیں۔ اصولاً کہنہ اور نئے پن کا مسئلہ ایسے مواقع پر بیان کیا جاسکتا ہے کہ جو تغیر و تبدل کے دائرہ میں آتے ہوں، جس کے نتیجہ میں کبھی بہتر اور شاداب اور کبھی نا مناسب عوامل کی وجہ سے فرسودہ اور افسردہ ہوجاتے ہیں۔

اس لئے، حقیقت شناسی سے مربوط بحثوں کے سلسلہ میں، جو فطری تقاضوں سے متعلق ہیں اور خلقت و کائنات کے حقیقی قوانین کی تحقیق کرتے ہیں (جن میں سے ایک یہی ہمارا زیر بحث مسئلہ ہے: کیا اسلام موجودہ حالات کے پیش نظر عالم بشریت کا نظم و نسق چلا جاسکتا ہے؟) اس کے بارے میں کہنہ اور نئے پن کا مسئلہ نہیں چھیڑنا چاہئے۔ ہر بات کی ایک خاص جگہ اور ہر نکتہ کا ایک مخصوص مکان ہوتا ہے۔ لیکن یہ کہ "کیا اسلام موجودہ حالات میں عالم بشریت کا نظم و نسق چلا سکتا ہے؟" یہ سوال بھی اپنی جگہ پر عجیب و

غریب ہے اور اسلام کے حقیقی معنی کے مطابق بھی جو قرآن مجید کی دعوت پر مبنی ہے یہ سوال انتہائی تعجب آور ہے۔ کیونکہ "اسلام" وہ راستہ ہے جس کی انسان اور کائنات کی خلقت کی مشینری نشاندہی کرتی ہے۔ "اسلام" یعنی وہ قواعد و ضوابط جو بشریت کی خاص فطرت کے مطابق ہیں اور انسان کی فطرت کے ساتھ رکھنے

والی مکمل ہم آہنگی کے پیش نظر انسان کی حقیقی ضرورتوں کو -- نہ فرضی اور جذباتی ضرورتوں کو -- پورا کرتے ہیں۔

ب دیہی بات ہے کہ انسان کے انسان ہو نے تک اس کی انسانی فطرت نہیں بدلتی اور انسان جس زمان و مکان میں ہو اور جس حالت میں بھی زندگی بسر کرتا ہو وہ اپنی انسانی فطرت پر گامزن ہوگا اور فطرت نے اس کے سامنے ایک راستہ معین کیا ہے، خواہ وہ اس پر چلے یا نہ چلے۔

اس بناء پر حقیقت میں مذکورہ سوال کا معنی یہ ہے کہ اگر انسان فطرت کی معین کردہ راہ پر چلے تو کیا وہ اپنی فطری خوشحالی کو پاسکتا ہے اور اپنی فطری آرزوؤں تک پہنچ سکتا ہے؟ یا مثال کے طور پر اگر کوئی درخت اپنی فطری راہ -- جو مناسب وسائل سے مجہز ہے -- پر چلے تو کیا وہ اپنی فطری منزل مقصود تک پہنچ سکتا ہے؟ واضح ہے کہ بدیہیات کے بارے میں اس قسم کے سوالات مسلمات میں شک و شبہ ایجاد کرنے کے مترادف ہیں

۱۔ سلام، یعنی فطرت کی راہ، ہمیشہ انسان کی حقیقی راہ ہے جو اس کی زندگی کے مختلف حالات کے پیش نظر نہیں بدلتی ہے۔ اس کے فطری مطالبات -- نہ جذباتی اور توہماتی خواہشات -- اس کے حقیقی مطالبات اور فطری منزل مقصود اور سعادت و خوشبختی تک پہنچنے کے مطالبات ہیں۔ خدائے تعالیٰ اپنے کلام میں فرماتا ہے:

﴿فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ذَلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ﴾ (روم / ۳۰)

”آپ اپنے رخ کو دین کی طرف رکھیں اور باطل سے کنارہ کش رہیں کہ یہ دین وہ فطرت الہی ہے جس پر اس نے انسانوں کو پیدا کیا ہے اور خلقت الہی میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی ہے۔ یقیناً یہی سیدہ اور مستحکم دین ہے۔“ اس مطلب کی مختصر وضاحت یہ ہے کہ ہمارے لئے واضح اور مشہور ہے کہ عالم خلقت میں مختلف مخلوقات موجود ہیں، ان مخلوقات میں سے ہر ایک کی اپنی زندگی اور بقاء کے لئے ایک مخصوص طریقہ کار اور خاص راستہ معین ہے اور وہ اپنی زندگی کی راہ میں منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے ایک معین راستہ پر گامزن ہیں اور ان کی سعادت و خوش قسمتی اس میں ہے کہ اپنی زندگی کی اس راہ میں کسی رکاوٹ سے دو چار ہوئے بغیر اپنی منزل مقصود تک پہنچ جائیں۔

دوسرے الفاظ میں اپنی زندگی اور بقاء کے راستے کو اپنے وجود میں پائے جانے والے وسائل اور اسلحوں سے استفادہ کرتے ہوئے کسی رکاوٹ کے بغیر طے کر کے سر انجام تک پہنچ جائیں۔

گیہوں کا دانہ پنے نباتی سفر میں ایک خاص راستہ طے کرتا ہے۔ اس کے داخلی ساخت و ساز کے مطابق موجودہ خاص نظم و اسلحوں، مخصوص حالات و شرائط میروہ عمل آتے ہیں اور گندم کے پودے کی نشوونما کے لئے ضروری عناصر کو معین مقدار اور نسبت میں جذب کر کے گندم کے پودے کی مخصوص راہ پر راہنمائی کر کے اسے منزل مقصود تک پہنچاتے ہیں۔ گندم کا پودا اپنی نشوونما کی راہ میں اندرونی اور بیرونی ماحول اور عوامل کے سلسلہ میں جس خاص روش کو اپناتا ہے، وہ کسی صورت میں قابل تغیر نہیں ہے۔ مثال کے طور پر کبھی ایسا نہیں ہوتا ہے کہ گندم کا اپنی نشوونما کا تھوڑا سا راستہ طے کرنے کے بعد ہی اچانک ایک سیب کے درخت میں تبدیل ہو جائے اور اس کی شاخیں، کونپلیں اور پتے نکل آئیں اپنی زندگی کی راہ میں ایک پرندہ میں تبدیل ہو کر پرواز کرے۔ یہ قاعدہ خلقت کی تمام انواع میں موجود ہے اور انسان بھی اس کلی قاعدہ سے مستثنیٰ نہیں ہے۔

انسان بھی اپنی زندگی میں، ایک فطری راہ اور ایک منزل مقصود رکھتا ہے جو اس کے کمال، سعادت اور خوشبختی ہے۔ اس کی بناوٹ کچھ ایسے اسلحوں سے مجہز ہے جو اس کی فطری راہ کو مشخص کرتے ہیں اور اسے حقیقی منافع کی طرف راہنمائی کرتے ہیں۔ خدائے متعال تمام مخلوقات میں موجود اس عمو می راہنمائی کی تعریف

میں فرمات ہے:

(< الذی ا عطی کلّ شی خلقه ثم ھدی> (طہ۔ ۵۰

” خدا وہ ہے جس نے ہر شے کو اس کی مناسب خلقت عطا کی ہے اور پھر ہدایت بھی دی ہے۔ (یعنی نفع کی طرف)“

انسان میں موجود خصوصی راہنمائی کے بارے میں فرماتا ہے: (< ونفس وما سؤھا فألھمھا فجورھا و تقوھا قد افلح من زکھا وقد خاب من دسھا> (شمس۔ ۷- ۱۰ ”اور نفس کی قسم اور جس نے اسے درست کیا ہے۔ پھر بدی اور تقویٰ کی ہدایت دی ہے۔ بیشک وہ کامیاب ہو گیا جس نے نفس کو پاکیزہ بنالیا۔ اور وہ نامراد ہو گیا جس نے اسے آلودہ کر دیا ہے۔“

مذکورہ بیان سے واضح ہوتا ہے انسان کی زندگی کا حقیقی راستہ -کہ جس میں اس کی حقیقی سعادت و خوشبختی ہے -وہ راستہ ہے جس کی طرف فطرت اس کی راہنمائی کرتی ہے اور یہ انسان اور کائنات کی خلقت کے تقاضوں کے مطابق حقیقی مصلحتوں اور منفعتوں کی بنیاد پر استوار ہے، چاہے یہ اس کے جذباتی خواہشات کے مطابق ہو یا نہ ہو۔ کیونکہ جذبات کو فطرت کی راہنمائی کی پیروی کرنی چاہئے اور اسی کے تابع ہو نا چاہئے نہ کہ فطرت انسان کے نفسانی خواہشات اور جذبات کے تابع ہو۔ انسانی معاشرہ کو بھی اپنی زندگی کو حقیقت پسندی پر استوار کرنا چاہئے نہ متزلزل توہمات اور دہوکہ دینے والے جذبات کی بنیادوں پر۔ اسلام کے قوانین اور دوسرے ملکی قوانین میں یہی فرق ہے۔ کیونکہ عام اجتماعی قوانین معاشرہ کے افراد کی اکثریت (نصف - ۱) کی خواہشات کے مطابق ہوتے ہیں۔ لیکن اسلام کے قوانین فطرت کی ہدایت کے موافق ہوتے ہیں جو ارادۃ الہی کی علامت ہے اور اسی لئے قرآن مجید تشریعی حکم کو خدائے متعال سے مخصوص جانتا ہے، جیسا کہ فرماتا ہے:

(< إن الحکم إلا للہ> (یوسف / ۴۰

”حکم کرنے کا حق صرف خدا کو ہے۔“

(< ومن احسن من اللہ حکما لقوم یوقنون> (مائدہ / ۵۰

”صاحبان یقین کے لئے اللہ کے فیصلہ سے بہتر کس کا فیصلہ ہو سکتا ہے؟“ اسی طرح جو کچھ ایک عام معاشرہ میں حکم فرما ہوتا ہے وہ یا لوگوں کی اکثریت کی خواہش اور مرضی یا ایک طاقتور مطلق العنان شخص کی خواہش کے مطابق ہوتا ہے، چاہے یہ حکمرانی حق و حقیقت کے مطابق ہو اور معاشرہ کی حقیقی مصلحتوں کو پورا کرتی ہو یا اس کے برخلاف ہو۔ لیکن حقیقی اسلامی معاشرہ میں حق و حقیقت کی حکومت ہوتی ہے اور لوگوں کو اس کی اطاعت و پیروی کرنی چاہئے۔

یہاں پر ایک اور شبہ کا جواب بھی واضح ہوتا ہے اور وہ یہ کہ ”اسلام انسانی معاشرہ کے مزاج کے مطابق نہیں ہے۔ جو انسانی معاشرے کا کل مکمل آزادی سے مالا مال اور ہر قسم کی کامیابی و کامرانی سے بہرہ مند ہیں، ہر گز تیار نہیں ہیں کہ اسلام کی اتنی پابندیوں کے تحت رہیں۔“

البتہ اگر ہم بشریت کو موجودہ حالات میں ’جبکہ اخلاقی زوال نے انسانی زندگی کے ہر پہلو پر اثر کیا ہے اور ہر قسم کی بے راہ روی اور ظلم و استبداد نے اپنا سایہ ڈالا ہے اور ہر لمحہ فنا و زوال کے بادل منڈلا رہے ہیں، فرض کریں اور پھر اسلام کا اس کے ساتھ موازنہ کریں تو ہم واضح اور روشن اسلام اور تاریکی میں ڈوبی بشریت کے درمیان کسی بھی قسم کی مطابقت کو نہیں پائیں گے اور ہمیں توقع بھی نہیں رکھنی چاہئے کہ اسلام کی موجودہ حالت کو جاری رکھتے ہوئے، یعنی جزئی طور پر اسلامی احکام کی ظاہری صورت عالم بشریت کی مکمل سعادت کو پورا کرے گی یہ تو قلع بالکل اس امر کے مانند ہے کہ ہم جمہوریت کا صرف دم بہرہ والی ایک

استبدادی اور مطلق العنان حکومت سے حقیقی جمہوریت کے نتائج اور فوائد کی توقع رکھیں یا یہ کہ بیمار ڈاکٹر کے نسخہ لکھنے پر ہی اکتفا کر کے صحت یاب ہونے کی امید میں بیہوش رہیں۔

لیکن اگر ہم صرف لوگوں کی خدا داد فطرت کو مد نظر رکھتے ہوئے اسلام - جو دین فطرت ہے - سے موازنہ کریں تو ہم اس میں مکمل موافقت اور ہم آہنگی پائیں گے۔ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ فطرت نے جس راستہ کو خود تشخیص دے کر معین کیا ہے اور اس کی طرف ہدایت کرتی ہے اور اس کے علاوہ کسی اور راستہ کو قبول نہیں کرتی ہے، اس کے ساتھ ہم آہنگ نہ ہو؟

البتہ لوگوں کی لا ابالی اور بے راہ روی کی وجہ سے پیدا ہوئی گمراہیوں اور کج فہمیوں سے جو آج کل فطرت دو چار ہے اس کی وجہ سے کسی حد تک فطرت اور اس کی معین کردہ طریقہ کار کی شناسائی میں شگاف پیدا ہوا ہے۔ لیکن ان ناگفتہ بہ حالات میں عاقلانہ روش یہ ہے کہ ان ناموافق حالات سے مقابلہ کیا جائے تاکہ زمینہ ہموار ہو جائے نہ یہ کہ منحرف کی گئی فطرت پر خط بطلان کھینچ کر انسانی سعادت و خوشبختی سے ناامید ہو کر چشم پوشی کریں۔ تاریخ گواہ ہے کہ تمام نئی روشیں اور نظام اپنے قیام کی ابتداء میں گزشتہ روشوں اور پرانے حالات سے سختی کے ساتھ نبرد آزما ہوتے ہیں اور بہت سی کشمکشوں - جو اکثر خوریزی پر مشتمل ہوتی ہیں - کے بعد معاشرہ میں اپنے قدم جما کر اپنے سابقہ دشمنوں کی یاد کولوگوں کے ذہنوں سے محو کر سکتے ہیں۔ جمہوریت کے تمام نظام جو ان کے طرفداروں کے عقیدہ کے مطابق لوگوں کی مرضی پر مبنی کامیاب ترین نظام ہیں، نے اپنے استحکام کے لئے فرانس اور دنیا کے دوسرے ممالک میں کئی خونیں انقلاب برپا کرنے کے بعد استحکام پایا ہے۔ اسی طرح کمیونسٹ نظام - جو اپنے طرفداروں کی نظر میں بشر کی ترقی یافتہ تحریک اور تاریخ کا عظیم تحفہ ہے - نے بھی اپنی پیدائش کی ابتداء میں سویت یونین میں پہر ایشیا، یورپ اور لاطینی امریکہ میں لاکھوں اور کروڑوں انسانوں کو خاک و خون میں غلطاں کرنے کے بعد استحکام پایا ہے۔ مجموعی طور پر ایک معاشرہ کی ابتدائی مرحلہ میں ناراضگی اور مزاحمت ایک روش کے نامناسب یا بے بنیاد ہونے کی دلیل نہیں ہوسکتی ہے۔ لہذا اسلام ہر حالت میں زندہ ہے اور معاشرے میں رائج ہونے کی قابلیت و صلاحیت رکھتا ہے۔

ہم اس موضوع پر آنے والی بحثوں میں وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالیں گے۔

اسلام اور ہر زمانہ کی حقیقی ضرورتیں بحت و تحقیق کے بارے میں پیش آنے والے اور نفی و اثبات قرار پانے والے علمی مسائل میں سے ہر مسئلہ کی اہمیت اور اس کی حقیقی قدر و قیمت ایک حقیقت کی اہمیت اور قدر و قیمت کے تابع ہے جو ان میں پائی جاتی ہے اور یہ ایسے آثار و نتائج کے تابع ہوتے ہیں جو عمل و نفاذ کے مقام پر ان کی تطبیق اور زندگی کے نشیب و فراز میں ان سے استفادہ کرتے وقت وجود میں آتے ہیں۔

انسان کو کھانا پینا سکھانے والا ایک انتہائی ابتدائی تصور، قدر و قیمت کے لحاظ سے انسان کی زندگی کے برابر ہے۔ یعنی اس کی قدر و قیمت وہی زندگی کی قدر و قیمت ہے جو انسان کی نظر میں ایک گراں بہا سرمایہ ہے، اور ایک تصور جو ظاہراً انتہائی معمولی اور مختصر ہے - جو انسان کے دماغ میں اجتماعی زندگی کی ضرورت کو ایجاد کرتا ہے - اس کی قیمت وہی ہے جو انسان کے حیرت انگیز نظام کی قیمت ہے جو ہر لمحہ انسان کے لاکھوں عمل و حرکات سکنت کو ایک دوسرے سے ربط دے کر ہر روز کروڑوں مطلوب اور نامطلوب اثرات کو پیدا کر کے گونا گوبڑے اور اچھے نتائج کو وجود میں لاتا ہے۔ البتہ اس بات سے ہرگز انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ ایک

مقدس دین - جیسے دین اسلام - کا انسان کی ضرورتوں کو ہر زمانہ میں پورا کرنا، اہمیت کے لحاظ سے اول درجہ رکھت ہے اور یہ انسان کی زندگی کی اہمیت کے برابر ہے کہ ہم اس سے قیمتی تر سرمایہ کا تصور نہیں کر سکتے

ہیں۔

البتہ دین اسلام کے بنیادی اصولوں سے کم از کم آگاہی اور دلچسپی رکھنے والا ہر مسلمان اس مسئلہ کو اسلام سے یاد کئے گئے مسائل کی فہرست میں درج کرتا ہے۔ حقیقت میں یہ فکری مادہ بھی اسلام کے وجود میں لائے گئے دوسرے دینی فکری مادوں کے مانند صدیوں سے ہم، اسلام کے پیروکاروں کے ذہنوں میں موجود ہے اور وراثت کے طور پر ایک فکر سے دوسری فکر میں منتقل ہوتا رہتا ہے اور اپنی خاموش زندگی کو جاری رکھے ہوئے ہے اور ہمیشہ دیگر مذہبی مقدسات کے مانند بحث و تمحیص سے دامن بچاتے ہوئے انسانوں کی سرشت میں منتقل ہوا ہے اور اس سے استفادہ نہیں کیا گیا ہے۔ ہم مشرقی ہیں اور جہاں تک ہمیں اپنے اسلاف اور آباواجداد کی تاریخ کے بارے میں یاد ہے، شاید ہزاروں سال گزر چکے ہوں گے، گزشتہ اجتماعی ماحول میں - ہم پر حکومت کی گئی - ہر گز ہمیں فکری، خاص کر سماجی مسائل سے مربوط علمی مسائل میں آزادی نہیں دی گئی اور صدر اسلام میں ایک مختصر مدت میں پیغمبر اسلام کے ذریعہ جو ایک کرن نمودار ہوئی تھی اور طلوع فجر کے مانند ایک نورانی دن کی نوید دیتی تھی چند خود پرستوں اور منافع خوروں کے تاریک حوادث طبعی اور مصنوعی طوفان کے نتیجہ میں دوبارہ تاریکی کے پردہ میں چلی گئی اور اس کے بعد ہم رہے اور اسیری و غلامی، ہم رہے اور تازیانے، تلواریں، پہانسی کے پھندے، زندانوں کی کالی کوہریاں، اذیت خانے اور مرگ آور ماحول، ہم رہے اور قدیمی فریضہ ”ہاہاں“ ”لیک“ ”و“ ”سعدیک!“

جو بہت چالاک تھا وہ اسی حد تک اپنے مذہبی مقدسات کے مادوں کو محفوظ کر سکتا تھا اور اتفاق سے وقت کی حکومتیں اور معاشرہ کا نظم و انتظام چلانے والے بھی اس رویہ کے بارے میں آزاد بحث کرنے میں رکاوٹ ڈالنے میں زیادہ بے غرض نہیں تھے۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ لوگ اپنے کام میں مشغول رہیں اور دوسرے امور میں دخل نہ دیں، یعنی وہ صرف اپنے کام میں لگے رہیں، حکومتی اور عمومی امور میں مداخلت نہ کریں کیونکہ ان کی نظر میں امور صرف حکومتوں اور معاشرہ کا نظم و انتظام چلانے والوں کا حق تھا! وہ لوگوں کے اغلب دینی امور اور نسبتاً سادہ دینی امور کے پابند ہونے میں اپنے لئے کسی قسم کا نقصان نہیں دیکھتے تھے اس لئے اس حالت سے نہیں ڈرتے تھے، وہ صرف یہ چاہتے تھے کہ لوگ تجسس اور تنقید پر نہ اتر آئیں اور وہ خود لوگوں کے مفکر بن کے رہیں۔ کیونکہ انہوں نے اس حقیقت کو اچھی طرح سے درک کیا تھا کہ زندگی میں طاقتور ترین وسائل افراد کے ارادہ کی طاقت ہے اور افراد کا ارادہ قید و شرط کے بغیر ان کے مفکرانہ مغز کے تابع رہے اور مفکروں کے مغز پر تسلط جما کر ان کے ارادوں پر تسلط جما سکیں، اس لئے وہ لوگوں کے افکار پر تسلط جمانے کے علاوہ کچھ نہیں سوچتے تھے تاکہ ہماری اصطلاح میں خود لوگوں کے مفکر بن کے رہیں۔

یہ حقائق کا ایک ایسا سلسلہ ہے جیسے اپنے اسلاف کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والا ہر فرد بڑی آسانی کے ساتھ سمجھ سکتا ہے اور اس کے لئے کسی قسم کا شک و شبہ باقی نہیں رہے گا۔

حال ہی میں یورپ کی آزادی مغرب کو سیراب کرنے کے بعد ہم مشرق زمین کے باسیوں کے ہاں آئی ہے، اس نے ابتداء میں ایک محترم مہمان کی حیثیت سے اور اس کے بعد ایک طاقتور گھر کے مالک کی حیثیت سے ہمارے بڑا عظم میں قدم جمائے ہے۔ اگرچہ اس آزادی نے افکار کے گہن کا بھریا بسترہ گول کر دیا اور آزادی کا نعرہ بلند کیا، یہ ایک بہترین وسیلہ اور مناسب ترین فرصت تھی جو ہمیں اپنی کھوئی ہوئی نعمت کو دوبارہ حاصل کر کے ایک نئی زندگی کی داغ بیل ڈال کر علم و عمل کو حاصل کرنے میں مدد کرتی، لیکن افسوس یورپ کی یہی آزادی، جس نے ہمیں ظالموں سے نجات دلائی، ان ہی ظالموں کی جانشین بن کر ہمارے دل و دماغ پر سوار ہو گئی!

ہم نہ سمجھ سکے کہ کیا ہوا؟ جب ہم ہوش میں آئے تو دیکھا کہ وہ دن گزر گئے تھے جب ہم اپنی حیثیت کے

مالک تھے اب خدا اور گزشتہ آسمانی طاقتوں کی باتوں پر توجہ نہیں کرنی چاہئے بلکہ ہمیں صرف اسی طرح عمل کرنا چاہئے جو کچھ یورپی انجام دیتے ہیں اور جس راہ پروہ چلتے ہیں، اسی راہ پر ہمیں بھی چلنا چاہئے! ایک ہزار سال سے سرزمین ایران ”بو علی سینا“ کو اپنی آغوش میں لئے ہوئی تھی اور اس کی فلسفی اور طبّی تالیفات ہماری لائبریریوں میں موجود تھیں اور اس کے علمی نظریات ورد زبان تھے اور کوئی خاص خبر نہیں تھی۔

سات سو سال سے ”خواجہ نصیرالدین طوسی“ کی ریاضی کی کتابیں اور ان کے ثقافتی خدمات ہمارا نصب العین تھا اور کہیں اس کی خبر تک نہیں تھی، لیکن ہم نے یورپیوں کے ان کے دانشوروں کے سلسلے میں یاد گار منانے کی تقلید کرتے ہوئے ”بوعلی سینا“ کے لئے ہزار سالہ یادگار اور ”خواجہ نصیرالدین طوسی“ کے لئے سات سو سالہ یاد گاری تقریبیں منعقد کیں۔ تین صدیوں سے زیادہ عرصہ سے ”صدرالمتاہین“ کافلسفی نظریہ ایران میں رائج تھا اور انہیں کے فلسفی نظریہ سے استفادہ کیا جاتا تھا۔ ایک طرف سے برسوں پہلے تہران یونیورسٹی کی داغ بیل ڈالی گئی ہے اور اس میں قابل توجہ صورت میں فلسفہ پڑایا جاتا ہے، لیکن جب چند برس پہلے ایک مستشرق نے اس یونیورسٹی میں اپنی تقریر میں ”ملاصدر“ کی تمجید و تعظیم کی اور اس کے فلسفی نظریہ کی تعریفیں کیں تو یونیورسٹی میں اس کی شخصیت اور اس کے فلسفی نظریہ کے بارے میں ایک بے مثال ہلچل مچ گئی۔ یہ ہ اور ان جیسے دوسرے واقعات ایسے نمونے ہیں جو عالمی سطح پر ہماری اجتماعی حیثیت اور ہماری فکری شخصیت کی ہویت کو واضح کر کے بتاتے ہیں کہ ہماری فکری شخصیت طفیلی ہے اور ہمارے فکری سرمایہ میں سے جو کچھ چوروں سے بچا ہے وہ جوتشیوں کے حصہ میں آیا ہے۔

ہم میں سے اکثر لوگوں کے فہم و ادراک کا یہی حال ہے۔ اور لوگوں کی جو اقلیت کسی حد تک اپنی فکری آزادی کو محفوظ کرسکی ہے اور اپنے دماغ کے سرمایہ کو مکمل طور پر اغیار کے ہاتھوں لوٹنے سے محفوظ رکھا ہے وہ بھی تعدّد شخصیت کے شکار ہوئے ہیں۔ یہ لوگ ایک طرف سے مغربی افکار کے دلدادہ اور دوسری طرف سے اپنے مشرقی اور موروثی افکار کے غلام بن گئے ہیں اور کہلم کہلا کوشش کر رہے ہیں کہ ان دو متضاد شخصیتوں کو آپس میں ملادیں۔

ہمارا ایک دانشور مؤلف ”اسلامی ڈیموکریسی“ کے عنوان سے اسلام کی روش کو ڈیموکریسی کی روش سے تطبیق کرتا ہے تو دوسرا ”اسلامی کمیونزم“ کے عنوان سے کمیونزم کی روش اور طبقاتی اختلافات کو دور کرنے کے طریقہ کار کو دین سے نکال کر پیش کرتا ہے۔

ایک عجیب داستان ہے! اگر حقیقت میں اسلام کی فطانت اور حقیقت پسندی صرف اسی میں ہے کہ واضح اور روشن ترین ظاہرداری کے ساتھ ہمارے پاس آئی ہوئی ڈیموکریسی اور کمیونزم کی زندہ روح اس میں ہونی چاہئے تو پھر کیا ضرورت ہے کہ ہم چودہ سو سال پرانے چند افکار کو انتہائی رنج و محنت کے ساتھ ان سے تطبیق کر کے اپنے سینہ پر لکادیں! اگر اسلام ایک مستقل حقیقت رکھتا ہے اور یہ حقیقت ایک جدا، زندہ اور گراں بہا حقیقت ہے تو کیا ضرورت ہے ہم اس کے خداداد حسن کو بناوٹی سجاوٹ سے پردہ پوشی کریں اور مصنوعی صورت میں اسے خریداروں کے سامنے پیش کریں! حالیہ چند برسوں کے دوراں، یعنی دوسری عالمی جنگ کے بعد مغربی دانشوروں نے ادیان و مذاہب کے بارے میں ایک خاص جوش و جذبہ کے ساتھ بحث و تحقیق کرنی شروع کی ہے اور اپنی تحقیق کے نتائج کو ہر روز منتشر کرتے ہیں اور بے شک ہم بھی، مذکورہ تقلید و تبعیت کے پیش نظر، کم و بیش اسی راہ پر چلتے ہوئے دین مقدس اسلام کے بارے میں چند سوالات کو اپنی گفتگو کا موضوع قرار دیتے ہیں:

کیا دین و مذہب سب حق ہے؟ کیا آسمانی ادیان اجتماعی اصطلاحات کی ایک کڑی کے علاوہ کچھ اور ہے؟ کیا دین روح کی پاکی اور اخلاقی اصلاح کے علاوہ کوئی دوسرا مقصد رکھتا ہے؟ کیا مذہبی احکام اسی شکل و صورت میں ہمیشہ باقی رہیں گے؟ کیا دین کا عملی احکام کے علاوہ کوئی اور مقصد بھی ہے؟ کیا اسلام ہر زمانہ کی ضرورتوں کو پورا کر سکتا ہے؟ کی اور کی

البتہ جب ایک محقق دانشور ایک مسئلہ سے نمٹتا ہے تو وہ سب سے پہلے مسئلہ کو مسلم علمی معیاروں سے تطبیق دے کر اس کی تفسیر کرتا ہے پھر اس کے صحیح یا غلط ہونے کے بارے میں بحث کر کے اپنا نظریہ پیش کرتا ہے۔ مغربی دانشور، دین کو ایک اجتماعی مظہر جانتے ہیں، جو خود معاشرہ کے مانند بعض فطری عوامل کا ایک معلول ہے۔

مغربی دانشوروں کی نظر میں تمام ادیان من جملہ اسلام - اگر دین کے موضوع کے بارے میں خوش فہم ہوں تو - چند غیر معمولی ذہانت رکھنے والے افراد کے آثار ہیں، جنہوں نے اپنے نفس کی پاکی، انتہائی ذہانت اور ناقابل شکست ارادہ کے نتیجہ میں اپنے معاشرہ کے اخلاق و اعمال کی اصلاح کے لئے کچھ قوانین وضع کر کے لوگوں کی زندگی کی سعادت کی راہ پر راہنمائی کرتے تھے۔ یہ قوانین انسانی معاشروں کے تدریجی ارتقاء کے ساتھ ساتھ تغیر پیدا کر کے ارتقاء کی آخری منزل تک پہنچتے ہیں۔

حس، تجربہ اور یہی تاریخ ثابت کرتی ہے کی انسانی معاشرہ تدریجی طور پر ارتقاء کی طرف بڑھتا ہے اور عالم بشریت تہذیب و تمدن کے میدان میں ہر روز ایک نیا قدم اٹھاتی ہے اور نفسیاتی، قانونی اور اجتماعی، حتیٰ فلسفی، خاص کر ”ڈیالیکٹک“ فلسفہ کے نتائج کے پیش نظر چونکہ معاشرے ایک ثابت حالت میں نہیں رہتے ہیں اس لئے معاشروں میں قابل نفاذ قوانین بھی ایک حالت میں باقی نہیں رہ سکتے۔ جنگلی میوے کھا کر غاروں میں زندگی بسر کرنے والے ابتدائی انسانوں کی سعادت مند زندگی کی ضرورتوں کو پورا کرنے والے قوانین، ہرگز آج کی تکلفاتی زندگی کے لئے کافی نہیں ہو سکتے۔

ڈنڈوں اور کلہاڑیوں سے جنگ کرنے والے زمانہ سے مربوط قوانین، آج کل کے ای می دور کے لئے کسی صورت میں فائدہ مند نہیں ہو سکتے۔ گھوڑوں اور گدھوں پر سفر کرنے والے زمانے سے مربوط قوانین، آج کل کے جٹ ہوائی جہاز اور آب دوز کشتیوں سے سفر کرنے کے زمانے کے کس درد کا علاج کر سکتے ہیں؟ مختصر یہ کہ آج کی دنیا نہ اپنے اسلاف کے قوانین کو قبول کرتی ہے اور نہ اس سے ان کو قبول کرنے کی توقع کی جاسکتی ہے۔ نتیجہ کے طور پر انسانی معاشروں میں نافذ ہونے والے قوانین مسلسل قابل تغیر ہیں اور عالم بشریت کے گونا گوں تحولات کے مطابق مکمل ہوتے ہیں اور اعمال کے قوانین میں تبدیلیوں کے پیش نظر اخلاق بھی قابل تغیر ہے، کیونکہ اخلاق وہی ثابت نفسانی صورتیں اور ملکہ ہے جو عمل کے تکرار سے وجود میں آتا ہے۔

دو ہزار یا تین ہزار سال قبل خاموش اور سادہ زندگی کو آج کی باریک اور پیچیدہ زندگی کی سیاست قبول نہیں کرتی، آج کے معاشرہ کی خواتین دو ہزار سال پرانی خواتین کی عفت پر عمل نہیں کر سکتی ہیں! عصر حاضر کے مزدور، کسان اور دوسرے محنت کش طبقے قدیم زمانے کے مظلوم طبقات جیسا صبر و تحمل نہیں رکھ سکتے ہیں۔ فضا کو تسخیر کرنے والے زمانہ سے مربوط انقلابی مغز والے انسان کو سورج گہن، چاند گہن اور سیاہ طوفان سے نہیں ڈرایا جاسکتا اور انہیں تو گل اور قضا پر تسلیم و رضا سے قانع نہیں کیا جاسکتا۔ مختصر یہ کہ ہر زمانہ کا انسانی معاشرہ اسی زمانہ کے مطابق و مناسب قوانین اور اخلاق چاہتا ہے۔

دوسری جانب سے اسلام کی دعوت نے ایک روش اور قوانین کے ایک سلسلہ کو مد نظر رکھا ہے، جو انسانی معاشرہ کی سعادت کی بہترین صورت میں ضمانت دیتے ہوئے انسانی زندگی کی ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں اور

”اسلام“ اسی واضح، روشن اور مقدس قوانین کا نام ہے۔ (۱) جیسا کہ ”اسلامی تحقیقات“ کے عنوان سے ہمارے پہلے مجموعہ میں ”قرآن کی نظر میں دین“ کے موضوع میں مفصل بحث ہوئی ہے۔

ب دیہی ہے کہ اس قسم کی روش اور قوانین ہر زمانہ میں مختلف مظاہر رکھتے ہیں ان میں خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی روش اور قوانین بھی ہیں جنہیں آپ اپنے زمانہ میں نافذ فرماتے تھے۔ دوسرے زمانوں میں بھی اسلام کے مظاہر بہترین اور مقدس ترین روش اور قوانین ہوں گے جو اس زمانے کے انسانی معاشرہ کی ضرورتوں کو پورا کر سکیں۔ اس بیان سے واضح ہوا کہ اس بحث میں مسلم علمی معیاروں پر تکیہ کرنے کے ضمن میں مغربی دانشور کا جواب مثبت ہوگا، لیکن مذکورہ تفسیر کے ضمن میں اس کی نظر میں اسلام ایک ابدی دین الہی ہے جو ہر زمانہ میں اس زمانہ کے معاشرہ کی سعادت کو ضمانت بخشنے کے لئے بعض قوانین کی صورت میں رونما ہوتا ہے۔

لیکن دیکھنا چاہئے کہ کیا اسلام کی آسمانی کتاب اور اس مقدس دین کے مقاصد ک بہترین ترجمان قرآن مجید بھی، نبوت کو مذکورہ معنی میں اور آسمانی دین کو اسی ترتیب سے - جیسے اجتماعی، نفسیاتی، فلسفی اور مادی بنیادوں پر تکیہ کر کے تعبیر کی گئی ہے - تفسیر کرتا ہے کہ ہر زمانہ میں اس زمانہ کے مطابق اس سے مخصوص کچھ جدا قوانین کو قبول کرتا ہے اور اگر اس کے برعکس کچھ ثابت اور ناقابل تغیر عقائد اخلاق اور قوانین کو وضع کر کے انسانی معاشرہ کو ان پر عمل کرنے کے لئے مکلف کرتا ہے، تو انہیں کیسے مختلف زمانوں کے لوگوں کی ضرورتوں سے تطبیق کیا جاسکتا ہے؟

کیا قرآن مجید یہ چاہتا ہے کہ انسانی معاشرہ زمانہ کے گزرنے کے ساتھ ساتھ ایک ثابت حالت میں رہے اور تہذیب و تمدن پر ترقی کے راستے مکمل طور پر بند رہیں اور انسان کی روزمرہ فعالیت مکمل طور پر سر بستہ رہے؟ یہ رواں فطرت اور عالم بشریت کے فطری نظام، سے مقابلہ کے مقام پر، جو اس کی حکومت کے قلمرو سے خارج نہیں ہے، کیسے نکلا ہے؟ یہ امر مسلم ہے کہ قرآن مجید اپنے بنیادی بیان سے آسمانی دین کے موضوع اور عالم غیب سے سرچشمہ حاصل کرنے، نظام خلقت اور اس مشہور دنیا سے رابطہ دینی احکام کے دائمی اور ثابت ہونے، انسانی اخلاق، ایک فرد یا انسانی معاشرہ کی خوشبختی و بدبختی کے بارے میں اس طرح وضاحت کرتا ہے جو ایک مغربی دانشور کی مذکورہ وضاحت سے مختلف ہے، ان مطالب کو قرآن مجید کی نظر سے دوسری صورت میں دیکھا جاتا ہے جبکہ بصری وسائل، مادی بحثوں کو دکھا تے ہیں۔

قرآن مجید دین اسلام کے طریقہ کار اور قوانین کو مسائل و احکام کا ایک ایسا سلسلہ جانتا ہے جو نظام خلقت، خاص کر انسان کی خلقت کو اسی اپنی متحول فطرت سے - جو عالم فطرت کا جز تھا اور لمحہ بہ لمحہ اپنے وجود میں تغیر پیدا کرتا ہے - اپنی طرف راہنمائی کرتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں قرآن مجید، اسلام کو قوانین کا ایک ایسا سلسلہ جانتا ہے کہ نظام خلقت کا تقاضا اس کے مطابق ہے اور اپنی بنیاد کی طرح ناقابل تغیر ہے اور کسی کی نفسانی خواہشات کے تابع نہیں ہے، اسلام کے یہ قوانین، حق کو مجسم جاننے والے قوانین، جیسے استبدادی اور مطلق العنان ممالک کے قواعد و ضوابط، جو ایک ڈپک میڑ اور حاکم کی مرضی یا اکثریت کے مرضی کے مطابق اشتراکی ممالک کے قوانین کی طرح متغیر نہیں ہوئے ہیں، اور صرف ان کے وضع اور تشریع کی زمام نظام خلقت کے ہاتھ میں ہے اور دوسرے الفاظ میں، خالق کائنات کے ارادہ کے تابع ہے۔ ہم اس مطلب کی تفصیلی وضاحت اس بحث کے دوسرے حصہ میں پیش کریں گے۔

اسلام، ہر زمانہ کی ضرورتوں کو کیسے پورا کر سکتا ہے؟ اجتماعی بحثوں کے دوران اس نکتہ کا کافی مشاہدہ کیا گیا ہے کہ انسان اپنے ارد گرد موجود حیاتی ضرورتوں کے پیش نظر ان کو تنہا پورا نہیں کر سکا ہے اور اپنی

زندگی کی ضرورتوں کو یکہ وتنہا پورا کرنے کی قدرت نہیں رکھتا تھا، اس لئے اس نے مجبوراً اجتماعی اور معاشرتی زندگی کا انتخاب کیا ہے، جس کے نتیجہ میں ایک شہر یا معاشرہ وجود میں آتے ہیں۔ اسی طرح ہم نے قانونی بحثوں میں بھی بہت سنا ہے کہ معاشرہ اپنے افراد کی زندگی کی ضرورتوں کو حقیقت میں اسی وقت پورا کر سکتا ہے جب ان کی ضرورتوں کے متناسب کچھ قوانین وجود میں آکر حکمرانی کریں تاکہ ان کے سایہ میں معاشرہ کا ہر فرد اپنے حقوق کو حاصل کر سکے اور زندگی کی سہولتوں اور امکانات سے استفادہ کر سکے اور افراد کی اجتماعی کارکردگی کے نتائج سے معاشرہ کے منعقد ہونے اور قوانین کی پیدائش کے سبب اپنا حصہ حاصل کرے۔ چنانچہ ان ہی دو نکتوں سے استفادہ کیا جاتا ہے کہ، اجتماعی قوانین کے اصلی عامل وہی انسان کی حیاتی ضرورتیں ہیں کہ انسان ان کو پورا کئے بغیر ایک لمحہ کے لئے زندگی گزارنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ معاشرہ کی تشکیل اور قانون کی پیدائش اور اس کے ہر وقت نفاذ کا براہ راست نتیجہ انہی ضرورتوں کو پورا کرنا ہے۔ بدیہی ہے کہ جو معاشرہ اجتماعی طور پر کسی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے اقدام نہ کرے، یعنی اس معاشرہ میں انفرادی کام دوسرے افراد سے کوئی ربط نہ رکھتے ہوں، تو اسے معاشرہ کا نام نہیں دیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح جن قوانین کا وجود میں آنا یا ان کا نفاذ، لوگوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے اور ان کی خوشبختی اور سعادت کا سبب بننے میں کوئی اثر نہ رکھتے ہوں، وہ حقیقی قوانین یعنی لوگوں کی زندگی کی ضرورتوں کو پورا کرنے اور ان کے حقوق کا تحفظ کرنے والے قوانین نہیں کہلاتے۔ ایسے قوانین وضوابط کا وجود ضروری ہے جو کم وبیش مکمل طور پر یا ناقص صورت میں معاشرہ کی ضرورتوں کو پورا کر سکیں اور لوگوں کے لئے قابل قبول ہوں۔ ان قوانین کی ہر انسانی معاشرہ میں حتیٰ وحشی اور پسماندہ معاشروں میں بھی ضرورت ہوتی ہے۔ منتہی پسماندہ معاشروں کے قوانین اور قومی ضوابط عادات اور رسوم کی صورت میں غیر منظم تصادم کے نتیجہ میں تدریجاً وجود میں آتے ہیں، یا ایک آدمی کے بیہودہ ارادوں کے ذریعہ یا چند طاقتور لوگوں کی طرف سے لوگوں پر ہونے والے جاتے ہیں اور نتیجہ کے طور پر اجتماعی زندگی کا اغلب حصہ تمام یا اکثر لوگوں کے لئے ایک واضح اور قابل قبول اصول پر مستحکم ہوتا ہے۔ اس وقت دنیا کے گوشہ و کنار میں ایسے لوگ بھی ملتے ہیں جو قومی آداب و رسوم پر زندگی بسر کرتے ہیں بدون اس کے کہ ان کی اجتماعی زندگی کاشیرازہ بکھر جائے۔ ترقی یافتہ معاشرے میں، اگر معاشرہ دینی ہو تو آسمانی شریعت حکومت کرتی ہے اور اگر معاشرہ غیر دینی ہو تو ان قوانین پر عمل درآمد ہوتا ہے جنہیں معاشرہ کے اکثر لوگ بالواسطہ یا بلا واسطہ وجود میں لاتے ہیں۔ بہر حال ایک ایسے معاشرہ کا سراغ نہیں مل سکتا ہے جس کے افراد کسی نہ کسی قسم کے قوانین وضوابط کے پابند نہ ہوں اور ایسا معاشرہ پیدا کرنا مشکل ہے۔

اجتماعی اور انسانی ضرورتوں کی تشخیص کا وسیلہ۔ چنانچہ معلوم ہوا کہ قوانین اور ضوابط کا اصلی عامل زندگی کی ضرورتیں ہیں۔ لیکن دیکھنا چاہئے ان ضرورتوں - جو درحقیقت وہی اجتماعی اور انسانی ضرورتیں ہیں - کو کس طرح تشخیص دی جائے۔

البتہ یہ ضرورتیں انسان کے لئے بالواسطہ یا بلاواسطہ قابل تشخیص ہونی چاہئیں اگرچہ اجمالی اور کلی طور پر ضمناً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا انسان اپنی زندگی اور اجتماع کی تکلیف کی تشخیص میں بھی کبھی خطا سے دوچار ہوتا ہے یا جس چیز کو بھی تشخیص دے دے اسی میں اس کی سعادت و خوشبختی ہوتی ہے اور اسے چون چرا کے بغیر قبول اور نافذ کرنا چاہئے؟ یعنی انسان کی وہی چاہت، اس کے حقیقی ہونے کی صورت میں، اسے ضروری طور پر قبول اور نافذ کرنے کی لیبیل لگا دے گی۔

لیکن آج کی ترقی یافتہ دنیا کی اصطلاح میں دنیا کے اکثر لوگ انسان کی چاہت کو قانون کی تشخیص دینے

والی چیز بتاتے ہیں، لیکن اس کے پیش نظر کہ ایک ملت کے تمام افراد کی چاہت یا بالکل یکساں نہیں ہوتی یا اگر کہیں توافق پیدا ہو جائے تو وہ بہت کم اور اختلافی موارد کے مقابلہ میں نا چیز ہوتا ہے جس پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا ہے، لہذا مجبوراً لوگوں کی اکثریت (نصف بعلاوہ ایک) کو قابل اعتبار جان کر اقلیت (نصف منہای ایک) کو مسترد کر کے اقلیت کی آزادی کو پائمال کیا جاتا ہے۔

البتہ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ انسان کے ارادہ اور چاہت کا اس کی زندگی کے حالات سے براہ راست ربط ہوتا ہے۔ ایک امیر آدمی، جو اپنی ضروریات کو پورا کرتا ہے، اپنے دماغ میں ہزاروں آرزوئیں رکھتا ہے کہ ایک مفلس و حاجتمند کے ذہن میں یہ آرزوئیں پیدا بھی نہیں ہو سکتی ہیں۔ یا بھوک کی وجہ سے جس شخص نے اپنا تاب و تحمل کھو دیا ہو، وہ ہر لذیذ اور غیر لذیذ کھانے کو کھا لیتا ہے، اگرچہ وہ کسی اور کا مال بھی ہو۔ جب کہ امیر آدمی ناز و نخروں سے صرف لذیذ کھانوں کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے۔ انسان آرام و آسائش کی حالت میں اپنے ذہن میں بہت سے خیالات کو پاتا ہے جن کا سختی اور مشکلات میں تصور تک نہیں کرتا!

اس لحاظ سے اجتماعی زندگی کی ترقی کے پیش نظر انسان کی ضرورتیں تدریجاً بدل جاتی ہیں اور ان کی جگہ پر دوسری ضرورتیں جانشین ہوتی ہیں اور انسان قوانین کے ایک سلسلہ کے اعتبار اور نفاذ سے بے نیاز ہو کر نئے اور دوسرے قوانین وضع اور نافذ کرنے یا پرانے قوانین میں تبدیلی لانے پر مجبور ہوتا ہے۔ اس لئے زندہ قوموں میں پرانے قوانین مسلسل بدلتے رہتے ہیں اور ان کی جگہ نئے قوانین لیتے ہیں۔ یہ بات واضح ہوئی کہ اس کی حقیقی علت یہ ہے کہ قوانین کو وجود میں لانے والا اور اس کی حمایت کرنے والا سبب ملت کے افراد کی اکثریت کی چاہت ہے اور یہی اکثریت کی مرضی قوم کے قواعد و ضوابط کو قانونی شکل دے کر ان پر حقیقت کی مہر لگا دیتی ہے، حتیٰ اگر ان کے معاشرہ کی حقیقی مصلحت ان قوانین میں نہ ہو، کیونکہ مثال کے طور پر فرانس کا ایک شخص فرانسیسی معاشرہ میں اس معاشرہ کا رکن اور جز اور اکثریت کے موافق ہونے کے ناطے محترم ہے اور مثال کے طور پر فرانس کا قانون جو چاہتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک فرانسیسی فرد کو تحفظ بخشے اور وہ بھی بیسویں صدی میں نہ یہ کہ ایک برطانوی فرد کی یا ایک فرانسیسی فرد کی دسویں صدی میں (قابل غور بات ہے!) اس سلسلہ میں بیشتر غور و خوض کرنے کی ضرورت ہے کہ کیا مذکورہ عامل انسان کی خواہشات میں مؤثر ہے اور تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ ان میں ہر لحاظ سے تبدیلی آتی رہتی ہے۔؟

اور یا پوری تاریخ بشریت میں انسانی معاشروں کے درمیان کوئی مشترک پہلو باقی نہیں رہتا ہے؟
ی اصل انسانیت - جبکہ فطر تازندگی کی چند ضرورتیں اس سے مربوط ہیں (چنانچہ کچھ دوسری ضرورتیں مختلف علاقوں اور زندگی کے مراکز کے حالات اور ماحول کے مختلف ہونے سے مربوط ہوتی ہیں) - تدریجاً بدل گئی ہے؟ اور پہلا انسان مثلاً آنکھ، کان، ہاتھ پاؤں، دماغ، دل، گردے، پھیپھڑے، جگر اور نظام ہاضمہ کے اعضاء - وہ ہم میں پائے جاتے ہیں - نہیں رکھتا تھا؟ ان اعضاء کی سرگرمی ایک دن ایسی نہیں تھی جیسی آج پائی جاتی ہے؟ کیا گزرے ہوئے لوگوں کو پیش آنے والے حالات، جیسے جنگ و خون ریزی اور صلح و آشتی کے معنی انسان کو نابود کرنے یا اسے محفوظ رکھنے کے علاوہ کچھ اور تھے؟ کیا شراب پینے کی صورت میں پیدا ہونے والی مستی، مثلاً (شراب کے افسانہ کے موجد) "جمشید" کے زمانہ میں آج کے زمانہ میں رکھنے والے مفہوم کے علاوہ کچھ اور مفہوم رکھتی تھی؟ اور اسی طرح کیا، "نکسیا" اور "باربد" جیسے موسیقی کاروں کی موسیقی کی لذت آج کی موسیقی کی لذتوں کے علاوہ کچھ اور تھی؟

مختصر یہ کہ کیا گزشتہ انسان کے وجود کی پوری بناوٹ آج کے انسان کی بناوٹ سے بالکل مختلف تھی؟ یا قدیم انسان کے اندرونی اور بیرونی حالات آثار، عمل اور ردعمل، آج کے انسان کے علاوہ کچھ اور تھے؟

۱۔ لبتہ ان تمام سوالات کے جوابات منفی ہیں۔ کسی بھی صورت میں یہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ انسانیت تدریجاً نابود ہو گئی ہے اور کوئی اور چیز اس کی جانشین بن گئی ہے یا جانشین ہوگی، یا یہ کہ اصل انسانیت جو سیاہ فام و سفید فام، بوڑھے جوان، عقلمند اور بیوقوف، قطب میں رہنے والے اور خط استوا پر رہنے والے اور پرانے زمانے کے انسان اور آج کے انسان میں مشترک ہے، مشترک ضروریات نہیں رکھتی۔ یا اگر یہ ضروریات مشترک بھی ہوں تو انسان کی خواہش اور ارادہ ان کو پورا کرنے سے مربوط نہیں ہے۔

جی ہاں، حقیقت میں یہ ضرورتیں موجود ہیں اور کچھ ثابت اور دائمی قوانین کی متقاضی بھی ہیں جن کا بدلنے والے قوانین سے کوئی ربط نہیں ہے، کوئی بھی قوم کسی بھی زمانہ میں اس کی زندگی کے لئے قطعی طور پر خطرہ بننے والے دشمن سے ممکن صورت میں جنگ کرنے سے گریز نہیں کرتی اور اگر ایسے دشمن سے نجات پانے کے لئے اسے قتل کرنے کے علاوہ کوئی اور چارہ نظر نہ آئے تو خوں ریزی برپا کرنے سے پیچھے نہیں رہتی۔ مثلاً کوئی معاشرہ اپنے افراد کی زندگی کے لئے ضروری تغذیہ کو نہیں روک سکتا ہے، یا ان کے جنسی تمایلات پر پابندی نہیں لگا سکتا ہے۔ اس قسم کے بہت سے نمونے موجود ہیں جو ناقابل تغیر احکام کی نشاندہی کرتے ہیں اور قابل تغیر احکام سے ان کا کوئی ربط نہیں ہوتا۔

مذکورہ بیانات سے چند موضوع واضح ہو جاتے ہیں : ۱۔ معاشرہ اور اجتماعی قوانین و ضوابط کی پیدائش کا اصلی عامل زندگی کی ضروریات ہیں۔

۲۔ تمام اقوام حتی وحشی قومیں بھی اپنے لئے کچھ قوانین اور ضوابط رکھتی ہیں۔

۳۔ موجودہ دنیا کی نظر میں زندگی کی ضرورتوں کو تشخیص دینے والا وسیلہ معاشرہ کے لوگوں کی اکثریت کی مرضی ہے۔

۴۔ اکثریت کی رائے ہمیشہ حقیقت کے مطابق نہیں ہوتی۔

۵۔ زمانہ کے گزرنے اور تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ کچھ قوانین بدلتے رہتے ہیں اور یہ قوانین خاص حالات سے مربوط ہوتے ہیں، لیکن قوانین کا ایک اور سلسلہ جو ”انسانیت“ کی بنیاد سے مربوط اور تمام ادوار کے انسانوں اور تمام شرائط اور ماحول میں مشترک ہیں، ناقابل تغیر ہیں۔ اب جبکہ یہ موضوعات واضح ہو گئے، ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام ک نظریہ کیا ہے ؟